آئی ایم ملالہ

کتاب کا اردو ترجمہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

Find More Books Visit : www.iqbalkalmati.blogspot.com

برمنگھم میں مقیم ملالہ یوسف زئی کی جانب سے "میں ملالہ ہوں" کے عنوان سے ایک کتاب تحریر کی گئی ہے۔ کتاب لکھنے میں ملالہ کی معاونت سنڈے ٹائمز سے وابستہ صحافی کرسٹینا لیمب نے کی ہے۔

کتاب میں اسلام، جہاد اور پشتون کلچر سے بیزاری سمیت وہ تمام مواد موجود ہے، جس سے اہل مغرب کو خوش کیا جا سکے۔ جبکہ پاک فوج اور انٹیلی جنس ایجنسیوں کو بھی نشانہ بنایا گیا ہے۔ کتاب میں جہاں ایک طرف علماء کا ذکر نہایت تضحیک آمیز انداز میں کیا گیا وہیں ملالہ نے اپنے والد کے سیکولر نظریات کا بھرپور پرچار کیا ہے اور وہ اس بات سے بھی اتفاق کرتی نظر نہیں آتی کہ سلمان رشدی شاتم رسول ہے۔ اس حوالے سے اس نے اپنے والد کے نظریات بیان کئے ہیں۔ جن کے نزدیک آزادی اظہار رائے کے حق کو تسلیم کیا جانا چاہئے۔ کتاب میں ملالہ نے شادی سے پہلے اپنے والد اور والدہ کے معاشقے کا ذکر بھی کیا ہے۔

کتاب لکھنے میں ملالہ کی معاونت کرنے والی کرسٹینا لیمب بینظیر بھٹو کے پہلے دور حکومت میں پاکستان میں بطور صحافی کام کر رہی تھی۔ پیپلز پارٹی کے کئی وزراء کے ساتھ اس کے ذاتی مراسم تھے اور یہ مشہور تھا کہ کرسٹینا خبر نکلوانے میں ماہر ہے کیونکہ وہ خبر حاصل کرنے کے لئے کسی بھی اخلاقی حد کو عبور کرنے میں عار محسوس نہیں کرتی تھی۔ ان دنوں ایک معروف انگریزی اخبار کے رپورٹر سے کرسٹینا لیمب کی دوستی ہوا کرتی تھی۔ اس رپورٹر کے مطابق ایک روز اسے معلوم ہوا کہ پیپلز پارٹی کے ایک مرکزی رہنما کے پاس "بڑے کام" کی خبر ہے لیکن وہ اسے شیئر کرنے پر تیار نہیں۔ جب کرسٹینا کے علم میں یہ بات آئی تو اس نے مذکورہ رپورٹر کے سامنے ہی پیپلز پارٹی کے رہنما کو فون کیا۔ اس رہنما نے کرسٹینا لیمب کو فوری طور پر گھر بلوا لیا۔ دوسرے روز کرسٹینا سے رپورٹر کی ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا کہ وہ خبر حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ بس ذرا رات وہاں رکنا پڑا اور صبح کی چائے پی کر واپس آ گئی۔

"امت" کے قارئین کے لئے اسی کرسٹینا لیمب کی معاونت سے لکھی گئی ملالہ کی کتاب کے منتخب اقتباس پیش کئے جا رہے ہیں تاکہ اندازہ ہو سکے کہ اہل مغرب اسے کیوں اس قدر سر آنکھوں پر بٹھا رہا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

Find More Books Visit : www.iqbalkalmati.blogspot.com

جب میں پیدا ہوئی تو گاؤں کے لوگ میری والدہ پر ترس کھاتے رہے کہ انہوں نے ایک لڑکی کو جنم دیا تھا اور وہ ان سے اظہار ہمدردی کر رہے تھے جبکہ کوئی بھی میرے والد کو مبارکباد دینے نہیں آیا۔ میں نے ٹھیک اس وقت آنکھ کھولی، جب سورج طلوع ہونے میں کچھ ہی دیر باقی تھی اور رات کا آخری ستارہ ٹمٹما رہا تھا۔

میری پیدائش کے موقع پر میرے والد قلاش تھے۔ ان کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ وہ والدہ کو کسی اسپتال لے جاتے یا کسی مڈ وائف کا انتظام کر پاتے لہٰذا ہمسایوں نے میری پیدائش میں مدد کی۔ میں ایک لڑکی تھی اور میں نے ایک ایسی سرزمین پر جنم لیا، جہاں صرف بیٹے کی پیدائش پر ہی بندوقوں سے ہوائی فائرنگ کر کے جشن منایا جاتا ہے جبکہ بیٹیوں کو پردے کے پیچھے چھپا لیا جاتا ہے اور بڑے ہو کر ان کا کام صرف کھانا پکانا اور بچے پیدا کرنا ہوتا ہے۔

ہمارے معاشرے میں شادیاں عموماً اہل خاندان طے کرتے ہیں۔ لیکن میرے والد اور والدہ کے درمیان ایک ''لو میرج'' ہوا تھا۔ میں نے کئی بار یہ کہانی سنی کہ شادی سے پہلے میری والدہ اور والد کس طرح آپس میں ملے تھے۔ ان دنوں میرے والد شانگلہ میں اپنے انکل کے ہاں پڑھنے جایا کرتے تھے۔ اس سے اگلا گھر میری والدہ کی خالہ کا تھا۔ یہی وہ مقام تھا، جہاں دونوں کو ایک دوسرے کی جھلک دیکھنے کا موقع ملتا۔ ان کی آنکھوں میں ایک دوسرے کے لئے پسندیدگی ہوا کرتی تھی۔ والد بتاتے ہیں کہ وہ میری والدہ کی خوبصورتی پر مر مٹے تھے۔

میرا تعلق ضلع سوات کے قصبے مینگورہ سے ہے۔ جب گیارہویں صدی عیسوی میں افغانستان کا سلطان محمود غزنوی یہاں حملہ آور ہوا تو وہ اپنے ساتھ وادی سوات میں اسلام بھی لے آیا اور ہمارا حکمراں بن بیٹھا۔ اس سے قبل وادی سوات بودھ حکمرانوں کی مملکت ہوا کرتی تھی۔ بودھ یہاں دوسری صدی عیسوی میں آئے اور انہوں نے سوات پر 500 برس تک حکمرانی کی۔ چینی مورخین نے سوات کے حوالے سے جو کہانیاں لکھیں ہیں۔ ان میں بیان کیا ہے کہ کس طرح دریائے سوات کے کنارے بودھ پیروکاروں کی 14 ہزار خانقاہیں تھیں اور ان خانقاہوں کی گھنٹیوں کی سحر انگیز آواز پوری وادی میں گونجا کرتی تھی۔ یہ خانقاہیں اب ماضی کا حصہ بن چکی ہیں لیکن ان کے آثار اب بھی جابجا پائے جاتے ہیں۔ میرے والد بھی گوتم بودھ سے بہت متاثر ہیں۔ انہوں نے ''بت کڑا کی باقیات'' کے عنوان سے ایک نظم بھی لکھی۔ اس نظم میں بتایا گیا ہے کہ مندر اور مسجد ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں۔ اس نظم کا ایک بند ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''جب میناروں سے حق کی صدا بلند ہوتی ہے بدھا مسکرانے لگتا ہے اور ماضی کی کڑیاں آپس میں جڑنے لگتی ہیں''

ہمارے ملک کی تاریخ بہت پرانی نہیں۔ لیکن بدقسمتی سے فوجی آمریت کے ادوار اس کی تاریخ کا بڑا حصہ ہیں۔ جب میرے والد 8 برس کے تھے تو ضیاء الحق نامی ایک جنرل نے ملک کی باگ دوڑ سنبھال لی۔ اس کی بہت سی تصاویر موجود ہیں۔ وہ ایک ڈراونا شخص تھا۔ جس کی آنکھوں کے گرد پانڈہ کی طرح سیاہ رنگ کے حلقے تھے اور اس کے دانت ہوشیار باش کی حالت میں کھڑے نظر آتے تھے۔ جنرل ضیاء نے ہمارے منتخب وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو گرفتار کر کے ان پر غداری کا مقدمہ چلایا اور بالآخر راولپنڈی جیل میں تختہ دار پر لٹکا دیا۔ ان کی پھانسی نے دنیا بھر میں پاکستان کو بدنام کر دیا۔ امریکیوں نے امداد بند کر دی۔ بعد ازاں جنرل ضیاء نے اسلامائزیشن کی تحریک شروع کی تاکہ پاکستان کو ایک باقاعدہ مسلم ملک بنایا جائے۔ جس کی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں کی محافظ فوج ہو۔ ضیاء اس پر بھی حکم لگاتے تھے کہ ہمیں نماز پڑھنی چاہئے اور انہوں نے ہر ضلع، دور دراز کے دیہات میں نماز کمیٹیاں قائم کیں اور ایک لاکھ نماز انسپکٹرز بھرتی کئے۔ ان سے قبل ''ملا'' محض نشان تمسخر ہی ہوا کرتا تھا جو میرے والد کے مطابق شادیوں میں کسی کونے کھدرے میں بیٹھا ہوتا اور جلد واپس ہو جایا کرتا۔ لیکن جنرل ضیاء کے دور میں اس ملا نے اتنا اثر و نفوذ حاصل کر لیا کہ اسے اسلام آباد میں خطبات و رہنمائی کے لئے طلب کیا جانے لگا۔ ضیاء کے دور میں پاکستان میں عورتوں کی زندگیوں پر مزید پابندیاں لگ گئیں۔ قائداعظم محمد علی جناح کہتے ہیں ''دنیا میں دو ہی طاقتیں ہیں ایک قلم اور دوسری تلوار جبکہ تیسری طاقت عورت کی ہے۔ جو ان دونوں سے زیادہ طاقتور ہے''۔ مگر اس کے برعکس جنرل ضیاء نے اسلامی قوانین متعارف کرائے جس میں عورت کی گواہی کم کر کے آدھی کر دی گئی۔ ہمارا ملک ہاکی کے کھیل میں ہمیشہ نمایاں رہا ہے۔ مگر ضیاء نے خواتین کھلاڑیوں کو مختصر لباس کے بجائے ڈھیلی ڈھالی شلواریں پہنا دیں اور چند کھیلوں پر تو خواتین کے لئے پابندی ہی لگا دی۔ ہمارے بیشتر مذہبی مدارس اسی وقت معرض وجود میں آئے۔ دینیات کو اسلامیات میں بدل دیا گیا جو پاکستان میں آج بھی رائج ہے۔ ہماری تاریخ کی کتابوں کو از سر نو تحریر کرایا گیا جس میں پاکستان کو اسلام کا قلعہ بتایا گیا۔ گویا ہم 1947ء سے پہلے بھی اپنا وجود رکھتے تھے۔ ہندوؤں اور یہودیوں پر لعن طعن کی گئی۔ جو، ان کتابوں کو پڑھے گا اسے یہی لگے گا یا وہ اسی غلط فہمی میں مبتلا ہوگا کہ ہم نے لڑی جانے والی تینوں جنگیں جیت لیں اور اپنے دشمن ہندوستان کو شکست فاش دی۔

جب میرے والد دس سال کے ہوئے تو ہر چیز تبدیل ہو چکی تھی۔ 1979ء کے کرسمس کے بعد روس نے ہمارے ہمسائے افغانستان پر حملے کر دیا۔ لاکھوں افغان وہاں سے بھاگ کر پاکستان آ گئے، جنہیں ضیاء نے پناہ دی۔ پشاور کے اطراف ہزارہا سفید خیمے گاڑ دیئے گئے جن میں سے چند آج بھی وہاں موجود ہیں۔ ہماری سب سے بڑی انٹیلی جنس سروس فوج سے تعلق رکھتی ہے۔ جسے آئی ایس آئی کہتے ہیں۔ اس نے ان کیمپوں میں سے افغانوں کو بھرتی کر کے مجاہدین کی حیثیت سے تربیت دینی شروع کر دی۔ افغان گو کہ نامی گرامی جنگجو رہے ہیں مگر کرنل امام جو اس پروگرام کے نگران تھے شکوہ کناں تھے کہ انہیں منظم کرنا ایسا ہے جیسے ''مینڈکوں کو تولنا''۔

Find More Books Visit : www.iqbalkalmati.blogspot.com

روس کے حملے نے جنرل ضیاء کو عالمی نفرت زدہ شخص کے بجائے آزادی کے عظیم دفاع کنندہ شخص میں بدل دیا۔ امریکی دوبارہ ہمارے دوست بن گئے کیونکہ روس ان کا دشمن اولین تھا۔ امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کی جانب سے کروڑوں ڈالر ہمارے خزانے کی جانب بہنے لگے، ساتھ ساتھ اسلحہ بھی تاکہ افغانوں کو سرخ کمیونسٹ فوج کے خلاف آئی ایس آئی تربیت دے۔ جنرل ضیاء کو صدر رونالڈ ریگن نے وہائٹ ہاؤس میں اور وزیر اعظم مارگریٹ تھیچر نے 10 ڈاؤننگ اسٹریٹ میں ملاقات کے لئے مدعو کیا اور ان کی تعریف و توصیف کی۔

افغانستان پر سوویت حملے کے وقت مسجد کے مولوی اپنے خطبات میں روسیوں کی ملامت کیا کرتے۔ انہیں کافر کہتے، لوگوں کو جہاد کرنے پر اکساتے کہ بقول ان کے بحیثیت اچھے مسلمان یہ ان کا فرض تھا۔ گویا جہاد ہمارے دین کا چھٹا رکن بنا دیا گیا تھا۔

جب بینظیر بھٹو ملک کی پہلی خاتون وزیر اعظم منتخب ہوئیں تو جنرل ضیاء کے دور میں طلباء تنظیموں پر لگائی پابندی کا خاتمہ ہوگیا۔ میرے والد نے بھی فوری طور پر طلباء سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ وہ پختون اسٹوڈینٹس فیڈریشن (پی ایس ایف) کے جنرل سیکریٹری تھے اور پشتونوں کے لئے مساویانہ حقوق چاہتے تھے، جبکہ فوج، بیوروکریسی اور حکومت کے اہم عہدوں پر پنجابی قبضہ جمائے بیٹھے تھے کیونکہ ان کا تعلق ملک کے ایک بڑے اور طاقتور ترین صوبے سے تھا۔ ان دنوں دیگر بڑی اور نمایاں طلباء تنظیموں میں سے ایک اسلامی جمعیت طلباء بھی تھی۔ جو مذہبی پارٹی جماعت اسلامی کی ذیلی تنظیم تھی۔ اسلامی جمعیت طلباء پاکستان کی متعدد یونیورسٹیوں میں ایک طاقتور ترین طلباء تنظیم تھی۔ ان کے لوگ طلباء کو کورس کی مفت کتابیں اور امداد فراہم کیا کرتے تھے لیکن ان کے نظریات عدم برداشت پر مبنی تھے اور وہ لوگوں پر اپنی مرضی مسلط کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے یونیورسٹیوں میں موسیقی کے کئی پروگراموں کو سبوتاژ کیا۔ ان دنوں کالج میں میرے والد کی دھواں دار بحث کا موضوع ایک ناول تھا۔ اس ناول کو سلمان رشدی نے "شیطانی آیات" کے نام سے لکھا تھا۔ یوں پوری دنیا کے مسلمانوں نے اسے شان رسالت میں گستاخی قرار دیا۔ مسلمان اس معاملے پر اتنے غصے میں تھے کہ اس کے علاوہ کوئی اور موضوع بحث تھا ہی نہیں۔ پھر ہماری خفیہ ایجنسیوں سے تعلق رکھنے والے ایک ملّا نے اردو اخبارات میں مضامین لکھنے شروع کئے اور اپنے آرٹیکلز میں اس کتاب کو پیغمبرؐ کی شان میں گستاخی قرار دیا اور مسلمانوں پر زور دیا گیا کہ ان کا فرض ہے کہ اس کے خلاف احتجاج کریں۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورے پاکستان میں "ملّا" باہر نکل آئے اور اس کتاب کی مذمت کرنے لگے۔ سب سے پرتشدد واقعہ اسلام آباد میں پیش آیا۔ جب امریکی پرچم نذر آتش اور امریکی سینٹر کے سامنے مظاہرے کئے گئے۔ اس صورتحال میں میرے والد نے کالج کے بند کمرے میں اس موضوع پر ایک بحث کا اہتمام کیا۔ بہت سے طلباء نے پرزور دلائل دیئے کہ اس کتاب پر پابندی عائد ہونی چاہئے اور اسے آگ لگا دینی چاہئے، جیسا کہ اس کے خلاف فتویٰ بھی آیا ہے۔ لیکن میرے والد آزادی اظہار رائے کے حق کو تسلیم کرتے تھے۔ انہوں نے اس میٹنگ میں کہا کہ ہمیں پہلے اس کتاب کو پڑھنا چاہئے اور پھر اس کا جواب اپنی جانب سے کتاب کی شکل میں ہی دینا چاہئے۔ بجائے اس کے کہ مظاہرے کئے جائیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

Find More Books Visit : www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہمارے علاقے کا جرگہ سسٹم عورتوں کی آزادی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ جہاں کوئی بیوہ بھی اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ شادی نہیں کر سکتی۔ جب میں نے اس قسم کے ایک واقعہ کی شکایت اپنے والد سے کی تو انہوں نے بتایا کہ ''افغانستان میں تو عورتوں کی زندگی اور بھی زیادہ اجیرن ہے''۔ میری (ملالہ) پیدائش سے ایک سال قبل افغانستان پر ایک ''کانے ملّا'' نے طالبان نامی تنظیم کے ذریعے قبضہ کر لیا تھا۔ اس ملا نے لڑکیوں کے اسکول جلا ڈالے۔ وہ لوگ آدمیوں کو داڑھی رکھنے پر مجبور کیا کرتے تھے۔ اتنی لمبی، جیسا کہ لالٹین ہوتی ہے۔ عورتوں کو برقع پہننے پر مجبور کرتے۔ ایسا برقع، جیسا کہ شٹل کاک کے اندر چل رہی ہوں۔ اس برقعے میں سے دیکھنے کے لئے صرف ایک جالی ہوتی ہے اور گرمیوں کے دنوں میں یہ اوون کی طرح دہکتا ہے۔ میرے والد نے یہ بھی بتایا کہ طالبان نے عورتوں کے قہقہہ لگانے پر بھی پابندی لگا رکھی تھی۔ عورتوں کو قید رکھا جاتا اور محض نیل پالش لگانے جیسی چھوٹی سی بات پر بھی بری طرح پیٹا جاتا تھا۔ جب میں اپنے والد سے اس قسم کے واقعات سنتی تو لرز جایا کرتی تھی۔ میں جین آسٹن کے ناول پڑھتی اور اپنے والد کے ان الفاظ پر اعتماد کرتی تھی...... ''ملالہ ایک پرندے کی طرح آزاد ہے''۔ ہم طالبان کو پسند نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ انہوں نے لڑکیوں کے اسکول تو دھماکے سے اڑائے ہی تھے بدھا کے مجسمے بھی توڑ ڈالے۔ ہمارے اپنے شہر میں بدھا کے کئی مجسمے تھے اور ہمیں ان پر فخر تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

Find More Books Visit : www.iqbalkalmati.blogspot.com

سوات میں فوجی آپریشن کے دوران ہم صرف فوج اور طالبان کے بارے میں ہی باتیں کیا کرتے تھے کہ ان دونوں کے درمیان ہم کس طرح پھنس کر رہ گئے ہیں۔ میری سہیلی عطیہ مجھے چڑانے کے لئے کہتی......

’’طالبان اچھے ہیں۔ فوج اچھی نہیں‘‘۔ میں جواب دیتی...... ’’اگر ایک سانپ اور شیر تمہاری طرف حملہ کرنے کے لئے بڑھیں تو تم کسے اچھا کہو گی؟ سانپ کو یا شیر کو‘‘۔ باہر کے ہیبت ناک ماحول کے مقابلے میں ہمارا اسکول ہماری جنت تھا۔ میری کلاس کی دیگر لڑکیاں ڈاکٹر بننا چاہتی تھیں لیکن میں موجد بننے کی خواہش مند تھی۔ تا کہ ایک ایسی مشین بناؤں، جو جگہ جگہ طالبان کو تلاش کر کے ان کا تمام اسلحہ برباد کر ڈالے۔

اپریل کے اوائل میں ایک معروف صحافی زاہد حسین کا سوات آنا ہوا۔ وہ ڈی سی سے ملنے کے لئے ان کی سرکاری رہائش گاہ پر تشریف لے گئے۔ انہوں نے وہاں جا کر جو منظر دیکھا وہ طالبان کے قبضے کا جشن تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ ڈی سی صاحب کے پاس اپنے مسلح محافظوں کے ہمراہ سینئر طالبان کمانڈر بشمول فقیر محمد بیٹھے ہوئے تھے۔ فقیر محمد باجوڑ کے عسکریت پسندوں کا لیڈر تھا جو آرمی کے ساتھ ایک خونی لڑائی میں مشغول تھا۔ فقیر محمد کے سر کی قیمت دو لاکھ ڈالر مقرر تھی لیکن اس کے باوجود وہ ایک سرکاری افسر کے ساتھ ڈنر کر رہا تھا۔ ہم نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ آرمی کا ایک بریگیڈیئر، فضل اللہ کی امامت میں نمازیں پڑھتا تھا۔

جب میرے والد اپنے دوستوں بالخصوص پرانے ساتھیوں احمد شاہ، محمد فاروق اور زاہد خان سے ملتے تو میں بھی ان کے ساتھ ہوتی تھی۔ احمد شاہ کا ایک اسکول تھا جہاں محمد فاروق ملازمت کیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی یہ لوگ اس کے لان میں بھی جمع ہوتے تھے۔ جبکہ زاہد خان ایک ہوٹل کا مالک تھا اور اس کا ایک بہت بڑا حجرہ تھا۔ جب وہ لوگ میرے گھر آتے تو میں انہیں چائے پیش کرنے کے بعد خاموشی سے بیٹھ کر ان کی باتیں سنتی تھی۔ وہ لوگ پشاور اور اسلام آباد کا سفر بھی کرتے اور بالخصوص وائس آف امریکہ اور بی بی سی اور دیگر میڈیا فورم پر ان کے انٹرویوز نشر ہوا کرتے تھے۔ میرے والد کا کہنا ہوتا تھا کہ طالبان سوات میں فوج اور بیوروکریسی کی پشت پناہی کے بغیر ٹھہر ہی نہیں سکتے۔ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ شہریوں کے حقوق کی حفاظت کرے لیکن اس وقت بہت مشکل پیدا ہو جاتی ہے جب ریاستی اور غیر ریاستی عناصر میں تمیز کرنا ممکن نہ رہے اور اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے آپ ریاست پر اعتماد کھو بیٹھیں۔ ہماری فوج اور آئی ایس آئی بہت طاقتور ہیں اور بہت سے لوگ ان کے بارے میں اس قسم کی باتیں کرنا پسند بھی نہیں کرتے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

Find More Books Visit : www.iqbalkalmati.blogspot.com

پسند بھی نہیں کرتے۔لیکن میرے والد اور ان کے بہت سے دوست ان باتوں سے خوف زدہ نہیں تھے۔ وہ کہا کرتے تھے ''آپ لوگ (فوج اور خفیہ ادارے) ہمارے لوگوں اور ہمارے پاکستان کے خلاف یہ کیا کر رہے ہو؟ طالبانائزیشن کی حمایت مت کرو یہ غیر انسانی فعل ہے''۔ ہمیں بتایا جاتا کہ سوات کو پاکستان کی خاطر قربانی کا بکرا بنایا جا رہا ہے۔لیکن میرے والد کا کہنا تھا کہ ریاست کی خاطر کسی شخص اور کسی چیز کو قربان نہیں کیا جانا چاہئے۔

سوات میں آپریشن کے خاتمے کے بعد گھروں کو ہماری واپسی ہوئی تو میرے والد اپنے اسکول کو دیکھنے کے لئے بے تاب تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ گئی۔ اسکول کے سامنے والی عمارت پر میزائل آ کر لگا تھا لیکن بظاہر اسکول محفوظ دکھائی دے رہا تھا۔ کسی وجہ سے میرے والد کی چابیاں کام نہیں کر پا رہی تھیں۔ ہم نے ایک لڑکے سے کہا کہ دیوار پھلانگ کر اندر سے دروازہ کھول دے۔ دروازہ کھل گیا تو ہم سیڑھیوں سے چڑھ کر اوپر کی جانب بڑھے۔ ہم جیسے ہی صحن میں داخل ہوئے تو میرے والد نے کہا ''کوئی یہاں موجود تھا''۔ صحن میں کرسیاں الٹی پڑی تھیں۔ اپنا علاقہ چھوڑنے سے پہلے میرے والد خوشحال اسکول کا بورڈ اتار کر صحن میں رکھ گئے تھے۔ جو دیوار کے ساتھ پڑا تھا۔ اس بورڈ کو اٹھاتے ہی میری چیخ نکل گئی۔ بورڈ کے نیچے بکروں کے سر پڑے تھے جو گل سڑ رہے تھے۔ لگتا تھا کسی نے وہاں دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ پھر ہم کلاس رومز کے اندر گئے۔ تمام دیواروں پر طالبان

www.iqbalkalmati.blogspot.com

Find More Books Visit : www.iqbalkalmati.blogspot.com

مخالف نعرے درج تھے۔ کسی نے وائٹ بورڈ پر مار کر سے جلی حروف میں "فوج زندہ باد" لکھ دیا تھا۔ اب ہمیں اندازہ ہونے لگا کہ ہمارے اسکول کی عمارت کو کون استعمال کرتا رہا ہے۔ ایک فوجی نے تو میری ہم جماعت لڑکی کی ڈائری میں محبت بھری نظمیں بھی لکھی ہوئی تھیں۔ زمین پر جابجا گولیوں کے خول بکھرے پڑے تھے۔ فوجیوں نے اسکول کی دیوار میں ایک ایسا سوراخ کر دیا تھا، جس سے پورا شہر نظر آتا تھا۔ ہوسکتا ہے انہوں نے اس سوراخ سے لوگوں کو نشانہ بھی بنایا ہو۔ مجھے افسوس تھا کہ ہمارا پیارا اسکول میدان جنگ بنا رہا۔ ابھی ہم اسکول کا جائزہ ہی لے رہے تھے کہ دروازے پر کسی نے زور سے دستک دی۔ میرے والد نے کہا "ملالہ دروازہ مت کھولنا"۔ اس دوران اپنے دفتر میں میرے والد کو آرمی کی جانب سے ایک خط ملا۔ اس خط میں آرمی نے ہم جیسے شہریوں پر الزام عائد کیا تھا کہ ہم نے طالبان کو سوات کنٹرول کرنے کی دعوت دی تھی۔ اس خط میں لکھا تھا "ہم اپنے بہت سے قیمتی فوجیوں کی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ پاک آرمی زندہ باد"۔ یہ خط پڑھ کر میرے والد نے کہا۔ "پہلے ہمیں طالبان نے ورغلایا پھر انہوں نے ہمیں مارا اور اب ہم پر الزام ہے کہ ہم ان کے حمایتی ہیں۔ اس لحاظ سے فوج اور عسکریت پسندوں میں کچھ زیادہ فرق نظر نہیں آتا"۔ ہمارے ایک پڑوسی نے بتایا کہ فوجیوں نے سامان عبرت کے لئے طالبان کی لاشیں گلیوں میں پھینک دی تھیں۔ اب ان کے ہیلی کاپٹر بھنبھنانے والے بڑے بڑے کیڑوں کی طرح جوڑوں کی صورت میں ہمارے سروں پر منڈلاتے ہیں۔ ہم گھر سے نکل کر دیواروں کے ساتھ چپک کر چلتے ہیں تاکہ ان کی نظر ہم پر نہ پڑے۔ ہم نے یہ بھی سنا کہ ہزاروں لوگوں کو گرفتار کرلیا گیا جن میں آٹھ سال تک کی عمر کے لڑکے بھی شامل تھے۔ جن کی بطور خودکش بمبار برین واشنگ کی گئی تھی۔ آرمی ان کو خصوصی کیمپ میں بھیج رہی تھی تاکہ ان میں شدت پسندی کو ختم کیا جاسکے۔ ان گرفتار شدگان میں ہمارے اردو کے ایک ٹیچر بھی شامل تھے۔ جنہوں نے لڑکیوں کو پڑھانے سے انکار کر دیا تھا اور بجائے اس کے ڈی وی ڈی اور سی ڈیز کو جمع کر کے تباہ کرنے کی مہم میں فضل اللہ کا ساتھ دینے کے لئے چلے گئے تھے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

Find More Books Visit : www.iqbalkalmati.blogspot.com

مولانا فضل اللہ کو لوگ ملا ریڈیو کہا کرتے تھے۔ اس ریڈیو کے ذریعے وہ لوگوں کو درس دیا کرتا۔ اس نے لوگوں کو متنبہ کیا تھا کہ موسیقی سننا چھوڑ دیں۔ فلمیں اور ناچ گانے ترک کر دیں۔ کیونکہ ان ہی گناہوں کی وجہ سے خدا نے ہمیں زلزلے جیسے عذاب میں مبتلا کیا۔ فضل اللہ گرج دار آواز میں کہتا اگر لوگوں نے گناہوں کو ترک نہ کیا تو پھر وہ خدا کے غضب کو دعوت دیں گے۔ میں نے اپنے والد سے کہا...... ''ابا، یہ ٹھیک کہہ رہا ہے؟'' ابا نے جواب دیا...... ''نہیں جانی، یہ لوگوں کو بے وقوف بنا رہا ہے''۔ فضل اللہ کو بالی ووڈ کی فلمیں بہت بری لگتی تھیں وہ ان فلموں کو غیر اسلامی کہتا تھا لیکن ہمیں یہ فلمیں بہت پسند تھیں۔

مشرف نے ہمارے لوگوں کو کہا کہ اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ امریکیوں کے ساتھ تعاون کیا جائے لیکن اس کے باوجود ہم امریکیوں کے ساتھ تعاون نہیں کر رہے تھے۔ کیونکہ آئی ایس آئی اب بھی طالبان کو مسلح کرنے میں مصروف تھی اور ان کے رہنماؤں کو کوئٹہ میں محفوظ پناہ گاہیں فراہم کر رہی تھی۔ آئی ایس آئی کے بہت سے افسران کے طالبان رہنماؤں سے قریبی روابط تھے۔ وہ برسوں سے انہیں جانتے تھے اور انہی جیسی سوچ رکھتے تھے۔

تقسیم ہند کا معاملہ ایسا ہی تھا گویا دو بھائیوں میں جھگڑا ہو گیا ہو اور وہ علیحدہ علیحدہ گھروں میں رہنا چاہتے ہوں لہذا برٹش انڈیا کو اگست 1947ء میں دولخت کر دیا گیا۔ اب ہمارے پاس ایک ملک ہے۔ جس کی آبادی 180 ملین ہے۔ جن میں سے 96 فیصد سے زائد مسلمان ہیں۔ ہمارے ملک میں تقریباً دو ملین عیسائی اور دو ملین سے زائد احمدی بھی آباد ہیں۔ احمدی کہتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں جبکہ ہماری حکومت انہیں مسلمان ماننے سے انکاری ہے۔ بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان اقلیتوں پر ہمارے ملک میں حملے ہوتے رہتے ہیں۔ ہمارے ملک میں زیادہ تر دینی مدارس قدامت پسند دیوبندیوں کے پاس ہیں۔ ہمارے ملک میں ایک فرقہ اہل حدیث بھی ہے، جنہیں سلفی کہا جاتا ہے۔ یہ فرقہ عربوں سے بہت متاثر نظر آتا ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں، جنہیں اہل مغرب بنیاد پرست کہتے ہیں۔

اقوام متحدہ میں کی گئی تقریر کے بعد مجھے پوری دنیا سے حمایت کے پیغامات موصول ہونا شروع ہو گئے لیکن میرے اپنے وطن میں اس حوالے سے بالکل خاموشی تھی۔ ماسوائے چند ٹوئٹر اور فیس بک پیغامات کے۔ جن میں پاکستانیوں نے مجھ پر تنقید کی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ میں نے صرف شہرت کی خاطر یہ تقریر کی ہے۔ ایک نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اپنے وطن کی تصویر کو دل سے نکال دو اور اب اپنے اسکول کو بھی بھول جاؤ۔ تمہیں وہ کچھ مل گیا۔ جس کی تمہیں تلاش تھی۔ یعنی بیرون ملک عیش و عشرت کی زندگی گزارنا۔

☆☆☆☆☆

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میڈیا خاموش کیوں؟؟؟

ملالہ کی کتاب کے متنازع پہلو کیا سامنے آئے کہ میڈیا کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ ہر طرف خاموشی۔ ٹی وی چینلز نے تو اپنے اوپر تقریباً ایک ایسی خود ساختہ سنسر شپ لگا دی کہ کتاب کے متنازع اقتباسات سے لوگوں کو آگاہ کیا اور نہ ہی اس مسئلے پر کوئی بات چیت کی۔ وہ کچھ جو ملالہ کی کتاب (I AM MALALA) میں لکھا گیا اگر کسی اور نے لکھا ہوتا تو ابھی تک کئی بریکنگ نیوز چل چکی ہوتیں، ٹاک شوز پر ٹاک شوز ہو چکے ہوتے، فتوے دیئے جا چکے ہوتے۔ مگر اب تک میری اطلاع کے مطابق صرف ایک ٹاک شو ہوا جس میں مجھے بھی شرکت کا موقع ملا۔ میڈیا کی تو ذمہ داری تھی کہ حقائق کو عوام کے سامنے رکھیں۔ ملالہ کو دنیا بھر میں میڈیا نے متعارف کرایا۔ اُس کے دنیا بھر میں لاکھوں کروڑوں چاہنے والے بنائے، میڈیا کی وجہ سے ہی ملالہ کی تعلیم کے لیے جدوجہد سامنے آئی اور پاکستان میں اُسے زبردست پذیرائی ملی۔ جب ملالہ پر حملہ ہوا تو دن رات ملالہ کی رپورٹس میڈیا پر چلائی گئیں۔ دنیا بھر سے اُس کے لیے دعائیں اور نیک خواہشات کے پیغامات آنے لگے۔ بچوں کے لیے ملالہ ایک ہیرو کی طور پر سامنے آ گئی۔ میڈیا نے پاکستان کے بچے بچے کی زبان سے ملالہ کا ساتھ دینے کا عہد سنوایا اور دکھایا۔ کچھ ایسے لوگ جو ملالہ کے بارے میں منفی باتیں کرتے تھے انہیں رد کیا گیا۔ کچھ لوگ تو یہ بھی کہتے تھے کہ ملالہ اسلام دشمن اور پاکستان دشمن قوتوں کے آلہ کار کے طور پر سامنے لائی گئی ہے اور اس میں اُس کے باپ کا اہم کردار ہے۔ ایسی تمام باتوں پر بہت کم لوگ یقین کرنے والے تھے۔ ملالہ سے عمومی طور پر پائی جانے والی ہمدردی کا یہ حال تھا کہ اُس کے والد کے بارے میں کچھ متنازع معاملات کو میڈیا تک نے کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ جب ملالہ کو حملہ کے بعد باہر بھیجا گیا تو حکومت کی طرف سے میڈیا کو یہ اطلاعات دی گئیں کہ اس کے والد ضیاء الدین نے حکومت کو دھمکی دی ہے کہ اگر اُسے لندن میں پاکستانی ہائی کمیشن میں نوکری نہیں دی جاتی تو وہ اپنی پوری فیملی کے ساتھ وہاں سیاسی پناہ لے لے گا۔ اگرچہ ملالہ کی کتاب میں اس الزام کی تردید کی گئی ہے مگر اس بات کا اُس وقت کے صدر آصف علی زرداری اور وزیر داخلہ عبدالرحمن ملک کے علاوہ دوسرے اور کچھ لوگوں کو بھی پتہ تھا بلکہ ملک صاحب نے یہ بات کچھ لوگوں کو خود بھی بتائی تھی مگر اس خبر کو میڈیا نے کوئی خاص اہمیت نہ دی کیوں کہ ایک مظلوم بیٹی کی عزت کا سوال تھا۔ صحت یابی کے بعد ملالہ نے برطانیہ، یورپ اور امریکا سے کئی ایوارڈز سمیٹے بلکہ اُس کو نوبل ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا۔ ساری دنیا اس انتظار میں تھی کہ اُسے نوبل ایوارڈ ملتا مگر ایسا نہ ہوا جس پر پاکستان میں بھی بہت بڑی تعداد میں لوگ مایوس ہوئے۔ اس تمام عرصہ میں ملالہ کو پاکستان کے لیے نیک نامی کمانے کا ذریعہ سمجھا گیا۔ ملالہ کو قوم کی بیٹی کا نام دیا گیا۔ وہ خود تو پاکستان کا وزیراعظم بننے کی خواہاں ہے اُس کے لیے تو پاکستان میں بھی مستقبل کی وزیراعظم بننے کی دعائیں کی جانے لگیں۔ صورت حال یہ تھی کہ سابق صدر زرداری اور بے نظیر بھٹو کی بڑی بیٹی بختاور نے بھی ملالہ کو پاکستان کی وزیراعظم بننے کی حمایت کر دی۔ اسی دوران ملالہ سے دنیا بھر کی اہم ترین شخصیات ملنے کے لیے بے تاب نظر آئیں۔ دوسروں کے علاوہ امریکی صدر بارک اوباما اور ملکہ برطانیہ تک نے ملالہ کو ملاقات کے لیے بلایا۔ یہ سب کچھ پاکستانیوں کے لیے ایک خواب سا تھا مگر جب ملالہ کی کتاب سامنے آئی تو سارا معاملہ مشکوک ہو گیا۔ اب یہاں میڈیا کی ذمہ داری بنتی تھی کہ وہ عوام کو بتائے کہ کتاب میں کیا لکھا ہے۔ کتاب میں متنازع اقتباسات کے بارے میں، میں نے پہلے ایک خبر دی اور پھر اس پر میں نے ایک کالم بعنوان ''کیا یہ وہی ملالہ ہے؟؟؟'' 24 اکتوبر کو لکھا۔ مجھ سے کچھ دن پہلے ایک اور کالم نگار نے اس معاملے کو اجاگر کیا۔ مجھے یہ امید تھی کہ ملالہ کی کتاب کے تنازعات اپنی سنگینی کی وجہ سے ٹی وی چینلز اور ٹاک شوز کے لیے اہم موضوع ہوں گے مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ ویسے بھی یہ میڈیا کی ذمہ داری تھی کہ کتاب سے متعلق حقائق کو عوام کے سامنے لائیں۔ جو بچے ملالہ بننے کی خواہش رکھتے ہیں انہیں یہ بتانا ضروری ہے کہ ملالہ نے اپنی کتاب میں کیا لکھا۔ اس بات پر بحث ہونی چاہیے کہ اُس نے ملعون سلمان رشدی کی کتاب پر اپنے باپ کے حوالے سے آزادی رائے کے حق کی بات کیوں کی اور ایسا کرنا کیوں انتہائی غلط تھا۔ اسی طرح دوسرے معاملات جن کا ہمارے عقائد اور دین سے تعلق ہے اُن کے متعلق متنازع بات کرنے کی ملالہ کو کیا ضرورت تھی۔ آخر ملالہ نے حضرت محمد ﷺ کا ذکر کرتے ہوئے ﷺ لکھنے سے کیوں گریز کیا۔ میڈیا کو چاہیے کہ ان تازہ تنازعات کے بعد اب اس سارے معاملے پر بحث کی جائے تاکہ یہ تعین کیا جا سکے کہ کیا ملالہ اب قوم کی بیٹی بننے کے قابل رہی یا نہیں۔ اُسے بڑے سے بڑا ایوارڈ ہی کیوں نہ ملے اور چاہے اُس کے لیے وائٹ ہاؤس اور بکنگھم پیلس کے دروازے چوبیس گھنٹوں کے لیے ہی کیوں نہ کھلے رہیں میں ذاتی طور پر تو نہیں چاہتا کہ میرے بچے کسی بھی طور پر ملالہ کی تقلید کریں اور اُسے ہیرو کے طور پر دیکھیں۔ مگر میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ ہم ملالہ کو گالیاں دینا شروع کر دیں۔ ہمیں اللہ سے دعا کے ساتھ ساتھ یہ کوشش کرنی چاہیے کہ ملالہ کو ایسے لوگوں اور قوتوں سے بچایا جائے جو اُسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ مگر جب میڈیا ڈنڈی مارے گا تو پھر عوام کو، ہمارے بچوں کو، ہمارے والدین کو کیسے معلوم ہو گا کہ ملالہ کیسے لوگوں کے شکنجے میں پھنس گئی۔ میرے گزشتہ کالم کے جواب میں مجھے کئی قارئین نے لکھا کہ ملالہ کو ہیرو بنانے والا میڈیا تھا اس لیے اب میڈیا اُس کی کتاب کے متعلق حقائق سے عوام کو آگاہ کرنے میں ہچکچاہٹ کا شکار ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ میڈیا میں بہت سوں نے صاف نیت سے ملالہ کے بارے میں لکھا اور بولا۔ اب ملالہ کی کتاب نے بہت سوں کو ایک شدید جھٹکا دیا اور کئی ایسے بھی ہیں جن کو اس کتاب پر کوئی اعتراض نہیں، اس لیے ندامت کیسی۔ میڈیا کو چاہیے کہ ملالہ کے معاملے سے سبق سیکھیں اور عوام کو بھی اصل حقائق سے آگاہ کریں۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو پھر یہ عوام اور ہمارے بچوں کے ساتھ دھوکے کے ساتھ ساتھ ملالہ کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرنے والوں کے حوصلے بھی بلند ہوں گے۔ یہاں میں ملالہ اور اس کے حمایتیوں کے لیے بددعائیں دینے والوں سے گزارش کروں گا کہ وہ اپنے پیارے نبی ﷺ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ ملالہ سمیت ہم سب کو ہدایت دے اور اُسے سیدھے راستہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے جو ہمارے لیے آخرت کی کامیابی کا ذریعہ بنے۔ آمین۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com